"اصول فلسفہ وروش رئالیسم"- چند صفحات کا مطالعہ (3)

Study of a few Pages from: "Principals of the Philosophy and Methodology of the Realism" (3)

Open Access Journal
Qtly. Noor-e-Marfat
eISSN: 2710-3463
pISSN: 2221-1659
www.nooremarfat.com
Note: All Copy Rights are Preserved.

Dr. Abou Hadi
Director Noor Research & Development Pvt (Ltd.); Islamabad.
E-mail: noor.marfat@gmail.com

Abstract:

This article is in fact, the 3rd part of the series discussion about Allama *Muhammad Hussain Tabatabai*'s book "Principles of the Philosophy and Methodology of the Realism"; a book annotated by the explanatory footnotes of Professor *Murtaza Mutahari*.

In the light of the words of *Allama Tabatabai* and professor martayred *Murtaza Mutahari*, the author has explaned the definition of philosophy, the types of cognitions, the need for philosophy and its difference from other sciences.

Along with this, the attitude and reasoning of the materialists against philosophy has been also examined. Furthermore, the topics and problems of philosophy and its relation with other sciences have also been highlighted. While explaining the relationship between philosophy and science, it is clarified that all sciences are dependent on philosophy for the affirmation of their subject. On the other hand, although philosophy is not dependent on the sciences, but it can hunt certain philosophical problems from the problems of science.

Key words: Philosophy, Realism, Idealism, Materialist, Science, Muhammad Hussain Tabatabai, Murtaza, Mutahari.

خلاصہ

پیشِ نظر مقالہ استاد مرتضی مطہری کے تشریحی نوٹس سے مزین، علامہ طباطبائی کی کتاب "اصول فلسفہ و روش ریالیسم" کے چند صفحات کے مطالعہ پر مشتمل سلسلۂ بحث کی تیسری قسط ہے۔ اِس مقالے میں علامہ طباطبائی اور استاد شہید مرتضی مطہری کے کلام کی روشنی میں فلسفے کی تعریف، ادراکات کی اقسام، فلسفہ کی ضرورت اور اس کے دیگر علوم سے فرق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فلسفہ کی بابت مادہ پرستوں کے رویّے اور استدلال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں، فلسفے کے موضوع و مسائل اور دیگر علوم کے ساتھ فلسفے کی نسبت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ فلسفے اور سائنس کے تعلق کے بیان کے ضمن میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ تمام علوم، اپنے موضوع کے اثبات میں فلسفے کے محتاج ہیں اور فلسفہ، اگرچہ سائنسز کا محتاج نہیں ہے، تاہم یہ سائنس کے مسائل سے بعض فلسفی مسائل کا انتزاع کرتا ہے۔

کلیدی کلمات: فلسفہ، ریالزم، آئیڈیالزم، مادہ پرست، سائنس، روش، محمد حسین، طباطبائی، مرتضی، مطہری۔

1. فلسفہ کیا ہے؟

علامہ طباطبائی نے اپنی کتاب "اصول فلسفہ و روش ریالیسم" کے پہلے مقالے کا عنوان "فلسفہ کیا ہے؟" قرار دیا ہے۔آپ فلسفہ کی تعریف پیش کرنے سے پہلے بطور مقدمہ رقمطراز ہیں کہ ہماری دنیا میں اَن گنت موجودات اور بے شمار مظاہر پائے جاتے ہیں اور ہم خود بھی اسی مجموعے کا ایک حصہ ہیں۔ لیکن یہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کو حقیقی Real سمجھ رہے ہوتے ہیں لیکن بعد میں انکشاف ہوتا ہے کہ وہ چیز، محض ایک وہم و سراب تھی۔ اس کے برعکس، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کو موہوم سمجھ رہے ہوتے ہیں، لیکن کچھ عرصہ بعد ثابت ہوتا ہے کہ وہ چیز حقیقت رکھتی تھی۔ بنابریں، اپنی دسترس میں موجود تمام اشیاء اور اُن کے اسباب کے بارے میں بحث اور تحقیق کے فطری غریزے کے تحت ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم حقیقی موجودات اور موہوم موجودات میں فرق ڈالیں۔ اب جو علم یہ کام انجام دیتا ہے، اُسی کا نام فلسفہ ہے۔ پس، " فلسفہ "، "حقائق" کی شناخت کا دوسرا نام ہے اور "حقائق" کو "اعتباریات" اور "وہمیات" سے الگ کرنا ہی فلسفے کا ایک بنیادی کام ہے۔

علامہ طباطبائی کے اس بیان کی وضاحت میں استاد مطہری لکھتے ہیں کہ یہاں اس نکتہ کی یاد دہانی ضروری ہے کہ ہمارے ذہنی مفاہیم 3 عمدہ اقسام میں تقسیم ہوتے ہیں:

۱۔ حقائق: یعنی وہ مفاہیم جن کا ہمارے ذہن سے باہر کی دنیا میں واقعی مصداق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے ذہن میں پائے جانے والے "پانی"، "ہوا" اور "خاک" کے مفاہیم؛ کہ ہمارے ذہن سے باہر کی دنیا میں ان تینوں مفاہیم کے واقعی اور عینی مصداق پائے جاتے ہیں۔ پانی ہماری پیاس بجھاتا ہے، ہَوا سے ہم آکسیجن حاصل کرتے ہیں اور خاک ہمارا بچھونا بنتی ہے۔ پس ایسے مفاہیم کو حقیقی مفاہیم کا نام دیا جاتا ہے۔

۲۔ اعتباریّات: یعنی وہ مفاہیم جن کا ذہن سے باہر کی دنیا میں کوئی واقعی مصداق نہیں پایا جاتا۔ لیکن ہماری عقل اُن کا کوئی نہ کوئی مصداق فرض کر لیتی ہے۔ یعنی ایک ایسی چیز کو اِن مفاہیم کا مصداق قرار دے دیتی ہے کہ جو حقیقت میں اُن کا مصداق نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر اگر ایک ہزار سپاہیوں سے ایک فوج تشکیل دی جائے تو ان میں سے ہر جوان، فوج کا ایک حصہ شمار ہو گا، فوج، اِن تمام سپاہیوں کے مجموعے کا نام ہو گا اور ہر سپاہی جوان کو فوج سے وہی نسبت ہو گی جو "جزو" کو "کُل" کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔

تو اِس مثال میں ہم ہر سپاہی جوان کے بارے میں الگ الگ شناخت بھی رکھتے ہیں جس کی بنیاد پر اُن کے بارے میں مختلف حکم لگاتے ہیں؛ لیکن جوانوں کے مجموعے کے بارے میں بھی کہ جسے ہم نے فوج کا نام دیا ہے، ایک شناخت اور ادراک رکھتے ہیں اور پوری فوج پر بھی مخصوص حکم لگاتے ہیں۔ تو یہاں ایک ایک فوجی جوان کے بارے میں ہمارا الگ ادارک اور اُن کی شخصی شناخت Personal Identity، درحقیقت، ہمارا حقیقی ادراک ہے۔ کیونکہ ہر سپاہی نوجوان، حقیقت کی دنیا کی ایک حقیقت ہے جو ہمارے اُس نوجوان کے ذہنی مفہوم کا ایک واقعی اور عینی مصداق ہے۔ لیکن جوانوں کے مجموعے، یعنی "فوج" کے بارے میں ہمارا ادارک، ایک اعتباری ادراک ہے، کیونکہ فوج (مجموعے) کے ذہنی مفہوم کا کوئی واقعی مصداق نہیں پایا جاتا۔ اگر عالم حقائق میں کوئی حقیقت پائی جاتی ہے تو وہ الگ الگ افراد (سپاہی) ہیں، مجموعہ (فوج) نہیں ہے۔ پس ایسے ذہنی مفہوم کو جس کا حقیقت کی دنیا میں کوئی مصداق نہ ہو، اعتباری مفہوم کا نام دیا جاتا ہے۔

۳۔ وہمیات: ایسے مفاہیم کہ جن کا عالم خارج میں کوئی مصداق نہیں پایا جاتا، بلکہ وہ باطلِ محض ہیں۔ مثال کے طور پر دیو، پَری یا عنقا یا بخت وغیرہ کا تصور۔

ہمارے ذہنی مفاہیم کی ان اقسام کے تناظر میں فلسفے کا کام حقائق کو اعتباریات سے جدا کرنا ہے۔ کیونکہ "وہمیات" کے بارے میں کم و بیش ہر شخص جانتا ہے کہ یہ حقیقت کی دنیا میں وجود نہیں رکھتیں؛ لیکن اعتباریات چونکہ حقائق کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہیں اور اُنہیں حقائق سے جدا کرنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے تو یہاں فلسفہ ہماری مدد کرتا ہے تاکہ ہم حقائق اور "اعتباریات" میں فرق ڈال سکیں۔ البتہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، بلکہ یہ اتنا

مشکل کام ہے کہ یہاں بڑے بڑے فلسفیوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔ استاد مطہری کے بقول:

"انسانی عقل و فہم کے بارے میں نقادّی کرنے والے یورپ کے جدید دانش مندوں نے کافی کوشش کی ہے کہ ذہن کے خود ساختہ مفاہیم کو ان حقائق سے جو عالم خارج میں واقعی طور پر پائے جاتے ہیں، جدا کر دیں۔ لیکن یہ مہم جوئی، ان دانش مندوں میں سے بعض کے جادۂ حق سے منحرف ہونے اور آئیڈیالزم (سفسطے) کی سرحد تک چلے جانے کا موجب بنی ہے۔ بلکہ ایک مقام پر پہنچ کر ان دانش مندوں نے تمام انسانی ادراکات کو فقط اور فقط ذہن کی ایجاد قرار دے دیا ہے۔ اور بعض لوگوں نے تو اس مہم جوئی میں شک کا مذہب (Skepticism) اختیار کر لیا ہے۔ اسلامی فلسفہ میں بھی اس موضوع پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور اعتباریّات کو حقائق سے جدا کرنے کے لیے مفید تحقیقات انجام پائی ہیں۔ ہم اس باب میں یورپی فلاسفرز کی نقادّی اور مسلمان دانش مندوں کی تحقیقات اس کتاب کے پانچویں مقالے میں پیش کریں گے جو کہ اسی موضوع کے ساتھ مختص ہے۔"[1]

بنابرایں، اپنی ماہیت کے لحاظ سے فلسفہ، سفسطے Idealism کے مقابلے میں ہے۔ کیونکہ سوفسطائی، انسانی ذہن سے باہر کی دنیا میں حقائق کا منکر ہوتا ہے اور وہ تمام ذہنی ادراکات و مفاہیم کو حقیقت سے عاری اور محض ذہنی اختراعات قرار دیتا ہے۔ لیکن فلسفی، ذہن سے باہر کی دنیا میں پائے جانے والے حقائق کو قبول کرتا ہے۔ اُس کے مطابق ہمارے بعض ذہنی ادراکات، حقیقی اور واقع کے مطابق ہوتے ہیں؛ لیکن بعض ادراکات اعتباری ہوتے ہیں۔

2. فلسفہ پڑھنا کیوں ضروری ہے؟

اپنی کتاب "اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کے پہلے مقالے میں علامہ طباطبائی مدعی ہیں کہ ہم دو لحاظ سے فلسفہ کے محتاج ہیں۔ ایک، اپنی فطری روح تحقیق کی وجہ سے۔ اور دوسرا، اس لیے کہ فلسفے کے علاوہ دیگر علوم فلسفہ کے محتاج ہیں۔ اس لئے کہ علوم خواہ طبیعی ہوں یا ریاضی، سائنسی روش سے کام کرنے والے ہوں یا یا برہان و قیاس کی بنیاد پر، سب کسی نہ کسی موضوع کے محتاج ہیں۔ کیونکہ جب تک کسی علم کا کوئی خاص موضوع نہ ہو، وہ علم وجود میں ہی نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علوم اپنے موضوع کے وجود کو ثابت شدہ اور واقعی فرض کرنے کے بعد اس کی خصوصیات اور اثرات کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔ پس کسی چیز کے بارے میں یہ اطمینان حاصل کرنا کہ وہ چیز

فلاں خصوصیت، فلاں حالت یا فلاں اثرات رکھتی ہے، اِس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پہلے ہمیں یہ اطمینان حاصل ہو کہ وہ چیز پائی بھی جاتی ہے۔ اب کسی چیز کے پائے جانے کا اطمینان کیسے حاصل ہو؟ یہ اطمینان ہمیں فقط فلسفہ دلا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام علوم، اپنے موضوع کے اثبات میں فلسفہ کے محتاج ہیں۔

3. فلسفہ اور دیگر علوم میں فرق

استاد مطہری نے علامہ طباطبائی کی مذکورہ بالا تحریر پر اپنے تشریحی نوٹ میں لکھا ہے کہ فلسفے اور دیگر علوم کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات بعض لوگ، "فلسفہ" اور "علم" کی اصطلاحات میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ آپ رقمطراز ہیں کہ فلسفے کا لفظ جس کی جڑیں یونانی زبان میں پائی جاتی ہیں، ماضی میں ایک وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ انسان کی تمام نظری اور عملی علوم فلسفہ کے دائرہ میں شامل تھے اور یہ لفظ تقریبا "علم" کے لفظ کے مترادف تھا۔ نہ فقط یونان میں، بلکہ قدیم مسلمان دانش مندوں کے ہاں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ لیکن جب سے بعض علوم میں "سائنسی تجربے" نے "قیاس و برہان" کی جگہ سنبھالی تو دانش مندوں کے ہاں "فلسفہ" اور "علم" کے الفاظ جدا جدا معانی میں استعمال ہونے لگے۔ لہٰذا وہ لوگ کہ جو تجربے اور عقلی قیاس و برہان، دونوں کو معتبر اور صحیح قرار دیتے ہیں، اُن کے ہاں فلسفے اور علم کے درمیان فرق یہ پایا جاتا ہے کہ ایسے مسائل پر بحث کہ جن تک انسان نے تجربے کی بدولت رسائی پاتا ہے، اُس کا نام "علم" ہے اور ایسے مسائل پر بحث کہ جن تک انسان، عقلی تاملات اور سوچ و بچار کے ذریعے پہنچتا ہے، اُس کا نام "فلسفہ" ہے۔

4. فلسفہ اور مادہ پرست

سترہویں صدی عیسوی میں چند دانش مندوں نے "عقلی برہان و قیاس" کے معتبر ہونے کا صاف انکار کیا۔ اُن کی نظر میں فقط حسّی تجربہ ہی بحث کا صحیح اور قابلِ اعتماد اسلوب ٹھہرا۔ ان کے مطابق، اگر کسی فلسفے کی بنیاد، علم (سائنس) پر استوار نہ ہو تو وہ بے پایہ اور بے بنیاد ہے۔ اور علم کی بنیاد حواس پر رکھی گئی ہے اور حواس کی دسترس فقط طبیعت کے ظواہر اور Phenomena تک ہے۔ پس فلسفہ اس لیے بے سود، نا قابل اعتماد اور حقیقت سے دُور ہے کیونکہ یہ صرف نظری و عقلی مسائل پر بحث کرتا ہے اور یہ اشیاء کے ظواہر کے بارے میں نہیں، بلکہ ان کے باطن Noumena اور کُنہ کے بارے میں بحث کرتا ہے جو کہ غیر محسوس امور ہیں اور اُن پر حواس سے کوئی دلیل قائم نہیں کی جا سکتی۔

انیسویں صدی عیسوی کے معروف فرانسیسی دانش مند Auguste Comte کا شمار بھی ان دانش مندوں میں سے ہوتا ہے جو فلسفے اور عقلی استدلال کے منکر ہیں۔ البتہ، کومٹے، سائنس کی بنیاد پر استوار، حسّی فلسفہ پر عقیدہ رکھتا ہے اور اُس کا فلسفہ Positivism کا فلسفہ ہے۔ Comte سائنسی علوم میں زیرِ بحث لائے جانے والے ایسے مسائل کو فلسفی مسائل کا نام دیتا ہے جو محسوسات کی دنیا کے کلی اور عمومی مسائل ہوتے ہیں۔ اُس کے مطابق چونکہ تمام سائنسی علوم یا اکثر سائنسی علوم میں، مختلف علوم کے باہمی روابط بیان ہوتے ہیں یا بڑے بڑے مفروضے قائم کیے جاتے ہیں تو اِن مسائل پر بحث ایک کلی اور عمومی بحث ہونے کے لحاظ سے فلسفہ سے شباہت رکھتی ہے، لہٰذا ایسی بحث کو "حسی فلسفہ" کی حیثیت سے قبول کیا جا سکتا ہے اور یہ معتبر بھی ہے۔

کومٹے کے بعد، فلسفہ کے منکرین میں ایک بہت بڑا گروہ، مادّہ پرستوں اور ڈیالیکٹک میٹیریالزم کے طرفداروں کا ہے۔ علامہ طباطبائی کی کتاب "اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کے پہلے مقالے کی ابتدائی مباحث پر اپنے تشریحی نوٹس میں استاد مرتضیٰ مطہری نے فلسفے کی اہمیت اور اس کے اعتبار validity کے منکرین کی آراء کا مختصر تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ آپ اس گروہ پر تنقید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> " تعجب اِس بات پر ہے کہ یہ دانش مند حضرات، عین اُس وقت کہ جب ایسے مسائل کے اثبات یا نفی کے درپے ہوتے ہیں کہ جن پر حسّ یا حواس سے کوئی گواہی موجود ہی نہیں ہوتی، دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہر جگہ تجربے اور حسّ کی منطق کے پیروکار ہیں۔ جیسا کہ اگلی بحثوں میں ثابت ہو جائے گا، ہمارے قاری کی اس امر پر ابھی سے توجہ رہے کہ مادی فلسفہ اور اس کا آخری نظام یعنی ڈیالیکٹک میٹیریالزم، درحقیقت، ایک "نظری فلسفہ" ہے، نہ کہ حسّی اور تجربی فلسفہ۔ "[2]

خلاصہ یہ کہ استاد مطہری کے بقول حسّی فلسفے کے حامی بظاہر تو یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ حس اور سائنسی تجربے کے پیروکار ہیں، لیکن عملی طور پر وہ فلسفۂ اولی کی بحثیں چھیڑتے ہیں اور ناخواستہ طور پر خالص عقلی مسائل کے اثبات یا ردّ کے درپے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا مادی فلسفے کی آخری شکل، یعنی جدلیاتی مادہ پرستی [ڈیالیکٹک میٹیریالزم] اپنی تشہیر کی غرض سے ابتدا میں تو حسّ اور حسّی علوم کی بات کرتی ہے اور بعض اوقات ایک سائنسی حقیقت میں تحریف کر کے اسے اپنے مدعا پر دلیل کے طور پر پیش کرتی ہے، لیکن یقیناً یہ اپنی منطق پر کاربند نہیں رہتی اور آگے چل کر ایسے مسائل کے بارے میں بحث میں الجھ جاتی ہے جو محض عقلی مسائل ہیں اور ان کا شمار فلسفۂ اولی کے نظری مسائل میں ہوتا ہے۔ اِن مسائل کے اثبات یا ردّ پر حسّ اور تجربہ سے کوئی گواہی موجود نہیں ہوتی۔

نتیجہ یہ کہ مادہ پرستوں نے فلسفے اور سائنس کی بحثوں کو آپس میں خلط ملط کر کے رکھ دیا ہے اور یہی ان کا سب سے

بڑا نکتہ ضعف ہے۔

5. فلسفہ اور دیگر علوم کا باہمی فرق

"اصول فلسفہ و روش ریالیسم" کے پہلے مقالے کے تشریحی نوٹس میں استاد مطہری نے فلسفی مسائل اور سائنسی مسائل کا فرق سمجھانے کے لیے ایک مقدمہ باندھا ہے۔ وہ مقدمہ یہ ہے:

"بنی نوع بشر کے ہاں رائج علوم میں سے ہر علم، چند مخصوص مسائل کے بارے میں بحث کرتا ہے جس کی بنیاد پر اُس علم کو ایک مخصوص نام دے دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر فزکس، کیمیا، حساب، ہندسہ، نجوم، بیالوجی وغیرہ وغیرہ۔ علوم کی ان شاخوں میں سے ہر شاخ، ایک خاص سنخ (قسم) کی معین معلومات تک ہماری رسائی ممکن بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علوم کی مباحث میں پڑنے سے پہلے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مثال کے طور پر فلاں علم پڑھ کر ہمیں کس طرح کی معلومات حاصل ہوں گی۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ "ہر علم، نام ہے کچھ ایسے مسائل کے بارے میں بحث کا جو ایک خاص موضوع اور خاص فیلڈ سے مربوط ہوں اور ہر علم کے مسائل آپس میں مربوط ہوتے ہیں اور اُن کا یہی ارتباط انہیں آپس میں جوڑتا اور دیگر علوم کے مسائل سے جدا کرتا ہے۔" لہٰذا اگر ہم کسی بھی علم کی تعریف تک رسائی حاصل کرنا چاہیں یا یہ جاننا چاہیں کہ فلاں مسئلے کو کن مسائل کی صف میں شمار کرنا اور اسے کس علم کا مسئلہ قرار دینا چاہیے تو پھر ہمیں مختلف علوم کے موضوعات کو سمجھنا ہوگا اور جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ مثال کے طور پر حساب کے علم کا موضوع کیا ہے اور ہندسہ کے علم کا موضوع کیا ہے، تب تک ہم حساب کے مسائل اور ہندسہ کے مسائل میں فرق نہیں سمجھ پائیں گے۔ دیگر علوم میں بھی معاملہ ایسا ہی ہے۔" [3]

اس مقدمے کی روشنی میں واضح ہے کہ فلسفہ بھی مخصوص مسائل کے حل کا عہدہ دار ہے اور اس کے مسائل کا بھی ایک خاص موضوع ہے۔ فلسفہ کبھی بھی سائنسز کے مسائل میں دخالت نہیں کرتا۔ ہاں! یہ اجازت بھی نہیں دیتا کہ سائنسز فلسفے کی حدود میں داخل ہوں۔ پس فلسفہ کے مسائل کو فلسفہ میں حل کیا جانا چاہیے اور سائنسز کے مسائل کو خود سائنسز میں۔ فلسفہ نہ اجازت دیتا ہے کہ اس کے مسائل کسی اور علم میں حل کیے جائیں اور نہ ہی یہ دیگر علوم اور سائنسز کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اور یہی فلسفے اور دیگر علوم کا عمدہ فرق ہے۔

6. فلسفے کا موضوع اور مسائل

اپنی کتاب "اصول فلسفہ وروش رئالیسم" کے پہلے مقالے میں علامہ طباطبائی نے وجود شناسی میں خطا اور صواب کے امکان کو در حقیقت، فلسفے کی ضرورت کا مقدمہ قرار دیا ہے۔آپ لکھتے ہیں:

"جیسا کہ ہم بعض اوقات اشیاء کے احکام و خواص میں غلط فہمی یا تردید کا شکار ہو جاتے ہیں، مثال کے طور پر ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں ترکیب میں یہ ذائقہ نہیں پایا جاتا (خواہ ہم یہ بات یقین اور قاطعیت سے کہیں یا شک و تردید کے ساتھ) حالانکہ اس میں وہ ذائقہ پایا جاتا ہو یا برعکس۔ اسی طرح بعض اوقات ہم اشیاء کے وجود کے بارے میں بھی خطأ یا جہل میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہ کہتے ہیں کہ روح عالم خارج میں پائی ہی نہیں جاتی یا بخت اور اتفاق نامی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ پس واضح ہے کہ سابقہ دو مثالوں میں بحث کی روش ایک نہیں ہے۔ بلکہ پہلے ایک چیز کے وجود کو ثابت کیا جانا چاہیے یا اسے مفروض الوجود قرار دے کر اس کے خواص اور احکام کے بارے میں بحث کرنا چاہیے۔" [4]

یہاں اپنے تشریحی نوٹس میں استاد مطہری رقمطراز ہیں کہ فلسفے کا موضوع اور مسائل، دیگر علوم کے موضوع اور مسائل سے یکسر مختلف ہے۔ کیونکہ فلسفہ کبھی بھی کسی ایک یا چند ایک مخصوص موضوعات کے احکام کے بارے بحث نہیں کرتا؛ بلکہ یہ برہان اور عقلی استدلال کی بنیاد پر ایسے مسائل کے بارے میں بحث کا نام ہے جن کا موضوع اور محور، "مطلق وجود" Absolute Existence اور اس کی خصوصیات یا احکام و عوارض ہیں۔ بنابرایں، فلسفہ اشیاء کے وجود و عدم کے بارے میں اور "مطلق ہستی" کے احکام کے بارے میں بحث کرتا ہے؛ جبکہ علوم میں سے ہر علم، کسی ایک یا چند ایک مخصوص موضوعات کو مفروض الوجود فرض کرنے کے بعد ان کے احکام و آثار کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ سائنسز میں بحث اشیاء کی بود و نابود کے بارے میں نہیں ہوتی؛ بلکہ ان کی خصوصیات اور اثرات کے بارے میں ہوتی ہے۔ فلسفے اور علوم کے فرق کو مزید اجاگر کرنے کے لیے استاد مطہری نے درج ذیل دو مثالیں پیش کی ہیں:

1. ہم ہندسے کے علم کو لیتے ہیں جس کی ایک بحث یہ ہے کہ ہر دائرے کا رقبہ، $C = 2\pi r$ کا فارمولا استعمال کرتے ہوئے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اب اس جملے کا معنی یہ ہے کہ جب بھی دائرہ واقعی وجود پائے گا تو اُس میں یہ خصوصیت پائی جائے گی۔ یعنی ہم نے پہلے ایک دائرہ فرض کیا ہے اور بعد میں اس پر یہ حکم

لگایا ہے کہ اُس کا رقبہ فلاں فارمولا کے تحت معلوم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ سوال درپیش ہو کہ آیا عالم ہستی میں دائرہ نام کی کوئی چیز پائی بھی جاتی ہے یا نہیں؟ اور کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جسے دائرہ سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں کثیر الاضلاع شکل ہوتی ہو؟ تو یہ مسئلہ، ہندسہ کے علم میں حل نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اسے فلسفے میں حل کرنا ہوگا۔ کیونکہ دائرے کے وجود یا عدم کے بارے میں بحث ہو رہی ہے، نہ کہ اس کے خواص اور احکام کے بارے میں۔

2. اگر معلوم کرنا ہو کہ آیا ہر جسم ایک خاص شکل رکھتا ہے یا ہر جسم سے خاص شعاعیں نکلتی ہیں؟ تو یہ مسئلہ فزیکل سائنسز کا مسئلہ شمار ہوگا۔ لیکن اگر مسئلہ یہ درپیش ہو کہ آیا "جسم" (3dimensional Thing) عالم ہستی میں پائی بھی جاتی ہیں یا نہیں، ایسی اشیاء حجم ہی نہیں رکھتیں؟ تو یہ مسئلہ فلسفی مسئلہ ہوگا۔

7. آیا فلسفہ، سائنس کا محتاج ہے؟

فلسفہ اور سائنسی علوم کے باہمی تعلق کے حوالے سے یہ سوال اہم ہے کہ آیا جس طرح سائنسز، اپنے موضوعِ بحث کے وجود کے اثبات میں فلسفے کے محتاج ہیں، فلسفہ بھی اپنے مسائل کے اثبات میں سائنسز کا محتاج ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں علامہ طباطبائی لکھتے ہیں کہ:

> "جس طرح تمام علوم، اپنی کاوشوں کے نتیجہ بخش ہونے میں فلسفہ کے محتاج ہیں، اسی طرح فلسفہ بھی اپنے بعض مسائل میں سائنسز کے بعض مسائل کا سہارا لیتا ہے تاکہ ان کے نتائج سے استفادہ کرتے ہوئے مسئلہ انتزاع کرے۔"[5]

اس نکتے کی وضاحت میں استاد مرتضی مطہری لکھتے ہیں کہ یہ بات بالکل درست ہے کہ فلسفہ اپنے بعض مسائل میں سائنسز سے استفادہ کرتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر فلسفہ، کسی سائنسی مسئلہ سے استفادہ کرے تو وہ سائنسی مسئلہ، بذاتِ خود فلسفی مسئلہ بن جاتا ہے۔ اور نہ ہی اس کا مطلب یہ ہے کہ فلسفے نے سائنسی مسئلے سے اپنے مسئلے کا "استنتاج" کیا ہے۔ بلکہ مقصد صرف اس بات کا بیان ہے کہ فلسفہ، سائنسز کے مسائل سے ایسے ایسے مسائل کا انتزاع کرتا ہے جو فلسفی پہلو رکھتے ہیں۔

بنابرایں، اگرچہ علامہ طباطبائی کے مذکورہ بالا بیان سے یہ تاثر ملتا ہے کہ فلسفہ بھی اپنے بعض مسائل میں سائنسز کا محتاج ہے؛ لیکن استاد مطہری یہاں "انتزاع" اور "استنتاج" کی اصطلاحات کی بہترین تشریح بیان کرتے ہوئے یہ واضح کر دیتے ہیں کہ نہ تو فلسفہ، دوسرے علوم کا محتاج ہے اور نہ ہی کوئی فلسفی مسئلہ، نہ من و عن، ایک سائنسی

مسئلہ قرار پا سکتا ہے۔

8. استنتاج اور انتزاع کا فرق

استاد مرتضی مطہری کے مطابق، "استنتاج" یہ ہے کہ ذہن ایک کلی حکم سے جزئی حکم کا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہمارے لیے یہ ثابت ہو جائے کہ "ہر طبیعی وجود فناء پذیر ہے" تو ہم اس کلی حکم سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ "درخت فناء پذیر ہے۔" اگر ہم اسی نتیجہ گیری کو منطقی شکل دینا چاہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ:

ہر طبیعی موجود فناء پذیر ہوتا ہے   درخت ایک طبیعی موجود ہے

پس، درخت فناء پذیر ہے۔

مذکورہ بالا مثال میں ہم نے ایک کلی حکم [ہر نیچرل شئے فنا پذیر ہے] سے ایک جزئی حکم [درخت فنا پذیر ہے] بطورِ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اس نتیجہ گیری کو "استنتاج" کہا جاتا ہے۔ "استنتاج" میں نتیجہ اخذ کرنے والا، درحقیقت، کوئی نیا انکشاف یا نیا کارنامہ سرانجام نہیں دیتا، بلکہ پہلے سے ثابت شدہ ایک کلی قانون کا ایک خاص نمونہ بیان کر دیتا ہے۔

اب اِس تناظر میں سوال یہ ہے کہ آیا فلسفی مسائل کو سائنسی مسائل سے استنتاج کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں استاد مطہری لکھتے ہیں کہ: " کبھی بھی فلسفی مسائل، علمی مسائل سے یوں استنتاج نہیں کیے جا سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس حکم سے نتیجہ نکالا جاتا ہے، اسے عام تر ہونا چاہیے یا دوسرے الفاظ میں اس کا دائرہ وسیع تر ہونا چاہیے اور جس حکم کو نتیجہ کے طور پر اخذ کیا جاتا ہے، اسے خاص ہونا چاہیے۔ اب چونکہ فلسفہ کے مسائل عام ترین مسائل ہیں، کیونکہ ان کا موضوع مطلق وجود ہے، اور "وجود" سب سے عام ترین موضوع ہے، لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک فلسفی حکم کو ایک سائنسی حکم سے بطور نتیجہ اخذ کیا جائے۔ کیونکہ ایسا صرف اُس صورت میں ہو سکتا تھا کہ سائنس کا موضوع، فلسفے کے موضوع کی نسبت وسیع تر ہوتا۔ حالانکہ سائنس کا موضوع "مادہ" ہے جس کی نسبت فلسفے کا موضوع، یعنی "وجود" وسیع تر مفہوم ہے۔

ہاں، یہ ممکن ہے کہ ایک فلسفی حکم کو ایک سائنسی حکم سے انتزاع کیا جائے۔ انتزاع کیا ہے؟ فلسفے اور نفسیات کی اصطلاح میں معمولا "انتزاع" اُس مخصوص ذہنی عمل کا نام ہے کہ جسے " تجرید" بھی کہتے ہیں۔ انتزاع یا تجرید یہ ہے کہ انسانی ذہن چند مشابہ اشیاء کا ادراک حاصل کرنے کے بعد ان کا آپس میں مقایسہ کرتا ہے۔ اُن کی امتیازی خصوصیات کو جدا کرتا ہے اور اُن کے درمیان پائی جانے والی مشترکہ خصوصیت کو جدا کرتا ہے۔ پھر اِس مشترکہ

خصوصیت سے ایک کلی مفہوم بناتا ہے جو ادراک شدہ تمام اشیاء پر صادق آتا ہے۔ اِس ذہنی عمل Process کو "انتزاع" کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارا ذہن پہلے زید، خالد، یاسر اور عمار وغیرہ وغیرہ کا ادراک حاصل کرتا ہے اور پھر ان کی امتیازی خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہوئے اُن کے درمیان ایک مشترکہ خصوصیت سے ایک کلی مفہوم اخذ کرتا ہے جسے ہم اپنی مثال میں "انسان" کا مفہوم نام دیتے ہیں۔

بنابرایں، فلسفہ اپنے بعض مسائل کو سائنسز کے مسائل سے انتزاع تو کرتا ہے لیکن یہ سائنسی مسائل سے کبھی اپنے مسائل کا استنتاج نہیں کرتا۔

*****

References

1. Allama Syed Muhammad Hussain Tabatabaie, *Usool-e Falsafa wa Rawish-e Realism*, Vol. 1 (Tehran, *Intesharat-e Sadra*, 1393 SH.), 39.

علامہ سید محمد حسین، طباطبائی، *اصول فلسفہ وروش رئالیسم*، جلد 1 (تہران، انتشارات صدرا، 1393ھ،ش)، 39۔

2 . Ibid, 42.
3 . Ibid, 43.
4 . Ibid, 42-43.
5 . Ibid, 45.